رئیس احمد جعفری

معتزلہ اور علوم فلسفہ

معتزلہ نے فلسفہ سے خادم کا کام لیا

دشمن کے اسلحہ سے مقابلہ

معتزلہ نے عقائد اسلامیہ کے دفاع اور اسلام کی تبلیغ وتبشیر کی مہم شروع کی اور جب انھوں نے مخالفینِ اسلام سے تعرض کرتے ہوئے ان سے مجادے اور مناظرے کا سلسلہ شروع کیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ حریف خاص قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہے اور جدل ومناظرے پر غیر معمولی عبور رکھتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مخالفین حضارت قدیمہ اور ثقافتِ عالیہ کے حامل ہیں۔ علومِ عقلیہ اور فلسفے میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے، اور متقدمین فلاسفہ کی کتابوں، تحریروں اور افکار ونظریات پر وسیع نظر رکھتے ہیں اس باب میں شام اور مصر اور فارس وعراق کے لوگ یکساں خصوصیات کے حامل تھے۔ شامی اور مصری حکومتِ بازنطین کے تابع تھے۔ بازنطینی حکومت ان دو حکومتوں میں سے ایک تھی جو ظہورِ اسلام سے قبل دنیا پر چھائی ہوئی تھیں، اور جن کا سکہ چل رہا تھا، بازنطینی حکومت مشرق میں دولت روم کی واحد وارث تھی۔ یہ جس حضارت کی حامل تھی وہ یونان اور روم کی حضارت کا مرکب تھی۔ یہاں کے باشندوں نے ان دونوں حضارتوں سے تاثر بھی قبول کیا تھا، اور ان کی بہت

> تاریخ کی کتابوں میں معتزلہ پر بکھرا ہوا مواد تو موجود ملتا ہے لیکن ان کی مبسوط تاریخ اب تک اردو کیا عربی میں بھی نہیں لکھی گئی تھی۔
>
> یہ کمی دار الفکر العربی کی شائع کردہ کتاب المعتزلہ نے پوری کردی ہے جس کے ایک باب کا ترجمہ نذرِ قارئین ہے۔

سی چیزیں اپنا بھی لی تھیں۔ انھوں نے ایسے متعدد مدارس قائم کیے تھے جہاں فلسفہ اور علوم معقول کی تعلیم و تدریس کا مکمل انتظام تھا۔ یہ لوگ مسائل لاہوتیہ پر بھی غور و خوض کرتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں یونانی علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کا ایک اور بہت بڑا مدرسہ سکندریہ میں تھا۔ اس دار العلم میں اسلام سے بہت پہلے اگرچہ علوم فلکیہ، طبیعیہ اور کیمیا گری وغیرہ کی تعلیم و تدریس ہوتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ایک بہت بڑا مرکز لاہوتی تحریک کا بھی تھا، جو حد درجہ وسعت حاصل کر چکی تھی۔ اس کے کارفرماؤں میں یہودی فلسفی فیلو[1] بھی تھا، اور اس شخص نے یہودی مذہب کو فلسفے میں آمیز کر دیا تھا۔

علوم عقلی ولاہوتی کی تعلیم و تدریس

اسی زمانے میں سوریہ (شام) میں بھی علوم عقلی ولاہوتی کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری تھا۔

خاص طور پر انطاکیہ کا مدرسہ تو لاہوتی تعلیم و تدریس کا شاید سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہ اسی مدرسے کے ابحاث کا نتیجہ تھا کہ مسیحیت مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئی اور نسطوریہ، ویعقوبیہ اور دوسرے فرقے عیسائیوں میں پیدا ہو گئے۔

سوریہ کے شمال مشرق میں حدود عراق کے ساتھ ساتھ چار دوسرے مدرسے وسیع اور عظیم پیمانے پر قائم تھے۔ ان میں سے دو نسطوری فرقے کے تھے اور دو یعقوبی فرقے کے۔ نسطوریوں کے مدرسے نصیبین[2] اور رہا[3] میں تھے، اور یعقوبیوں کے راس العین[4] اور

۱۔ ۲۰ ق م ۔ ۴۰ ق م

۲۔ نصیبین: عراق کے شمالی مغرب کا ایک شہر جو بازنطینی حکومت کے ماتحت تھا۔ ۴۶۳ء میں جب اہل فارس کا یہاں قبضہ ہو گیا تو علمائے نصاریٰ نے یہ مدرسہ بند کر دیا اور ارض بازنطین میں اس امید کے ساتھ منتقل ہو گئے کہ وہاں آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکیں گے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

قنسرین(۱) میں ان مدارس میں تمام تر امور لاہوتیہ اور فلسفہ کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

نسطوری علماء کے مدرسے

لیکن پھر حکومت فارس نے خود دو مدرسے قائم کیے۔

ایک نصیبین میں، یہی مدرسہ تھا جسے نسطوری عیسائی خود چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن جب بازنطینی حکومت نے بھی انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیا تو یہ علماء نسطوری جو اراضی بازنطینی کو پناہ گاہ سمجھ کر گئے تھے پھر واپس نصیبین آ گئے اور اپنا مدرسہ از سر نو جاری کر دیا۔ جو رہا میں مقفل کر دیا گیا تھا۔

نسطوری علماء نے جب پھر سے یہ مدرسہ کھولا تو اہل فارس نے انھیں خوش آمدید کہا، اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچائیں کہ فلسفہ و لاہوت کی بحث و تدریس کا کام حسب سابق جاری رکھیں۔

دوسرا مدرسہ جندیسابور میں قائم کیا جو ولایات فارس میں سے خوزستان کا دارالحکومت تھا۔ نوشیرواں نے چھٹی صدی عیسوی میں اسے فتح کیا تھا اور علمائے نساطرہ کو بلا کر یہ ذمے داری سونپی تھی کہ اپنی تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ یونانی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کریں۔ یونانی حضارت

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

۲۔ الرہا: مابین حدود عراق و سوریہ ایک شہر کا نام ہے۔ نصیبین سے رخصت ہو کر نسطوری علماء نے اپنا مدرسہ یہاں قائم کیا (۳۶۳ء) پھر نسطوریوں کی فرقہ وارانہ چپقلش کے باعث بازنطینی حکومت ۴۸۹ء میں اس پر تالا لگا دیا۔

۳۔ راس العین: ارض جزیرہ کا ایک شہر جو رہا سے ۱۱ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

۱۔ قنسرین: فرات عربی کے کنارے پر یہ شہر واقع تھا۔

سے اہل فارس کا تاثر اسی صورت احوال کا نتیجہ تھا۔

جندیسا بور ہندوستان سے بھی قریب تھا۔ چنانچہ ہندی حضارت کے اثرات بھی یہاں پہنچنے لگے۔ اس طرح یہ مدرسہ حضارات سہ گانہ کا گزرگاہ، اور مرکز بن گیا۔ ایک یونانی حضارت دوسری خود فارسی حضارت اور تیسری ہندی حضارت۔ یہ ایک ایسا مرکز تھا جہاں دو بڑے مذاہب مسیحیت اور مجوسیت میں ٹکر ہوئی۔

مدرسہ جندیسا پور ایک عرصۂ دراز تک قائم رہا۔

۱۴۸ھ میں یہاں کا ایک شخص خلیفہ منصور کے معالجے کے لیے بغداد طلب کیا گیا، اور منصور کے بعد عباسی خلفاء یہاں کے اطباء کو برابر بلا بلا کر قدر افزائی کرتے رہے۔[۲]

دینی عقائد فلسفی اصول پر

یہی وجہ تھی کہ ان کے لیے یہ بات بہ آسانی ممکن ہو سکی کہ اپنے دینی عقائد کو فلسفی اصول پر مرتب کریں۔ اور منطقی و دقیق کلام سے کام لیں، نیز مجادلے اور مناظرے میں مہارت حاصل کر لیں۔

ان حالات میں معتزلہ نے محسوس کیا، اور بجا طور پر محسوس کیا کہ حریف کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک اسی کے اسلحہ کام میں نہ لائے جائیں، اور اسی کی بولی میں بات نہ کی جائے، اور اسی کے داؤں پیچ اس کے خلاف استعمال نہ کیے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے طے کر لیا کہ حریف پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ضروری اور لازمی ہے کہ فلسفہ کی تحصیل کی جائے اور اس سے مدد لے کر حریف کے دلائل کو توڑا جائے، اور اپنی بات بالا رکھی جائے کیونکہ ادلۂ نقلیہ ایک مسلمان کے لیے تو بے شک کفایت کر سکتے ہیں، لیکن ایک غیر مسلم کے لیے اور وہ بھی مخالف غیر مسلم کے لیے کفایت نہیں کر سکتے۔ اسے تو صرف براہین عقلی اور دلائل غیر نقلی ہی سے ہرایا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایضاً

۲۔ اخبار العلماء باخبار الحکماء للقفطی، ص ۱۰۱، ۱۰۲

چنانچہ معتزلہ نے درس فلسفہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز کردی تاکہ دشمن کا مقابلہ اسی کے ہتھیاروں سے کرسکیں۔ اسی بولی میں بات کریں جو اس کی ہے۔ وہ اسالیب اختیار کریں جس سے وہ مالوف ومانوس ہے۔

اور شاید اسی ضرورت کا احساس تھا جس نے خلیفہ منصور کو اس امر پر آمادہ کیا کہ غیر زبانوں کی کتب کا ترجمہ عربی میں کرائے۔

منصور عمرو بن عبید کا دوست تھا اور یہ عمرو بن عبید رئیس معتزلہ تھا، اور اپنے وقت کا عظیم المرتبت شخص تھا۔

اور شاید یونانی کتابوں کا عربی ترجمے پر اکسانے والا یہی جذبہ تھا جس نے خلیفہ مامون کو آمادۂ عمل کیا چنانچہ مقریزی کا بیان ہے:

"مامون کے حکم سے چند سال کے اندر فلسفے کی بہت سی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوگیا۔ معتزلہ نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انھیں پڑھا، اور پرکھا۔"[۱] اور اس طرح اپنے آپ کو ان کے اسلحہ سے مسلح کرلیا۔

نظّام اور فلسفۂ یونان

ان کتابوں سے سب سے پہلے جس شخص نے استفادہ کیا وہ نظّام ہے۔

شہرستانی کا بیان ہے کہ نظّام نے فلسفے کی بہت سی کتابوں کو پڑھا اور کھنگالا[۲]۔ بعد میں دوسرے لوگ بھی اس کے نقش پر چل پڑے۔

گویا اسلام میں معتزلہ سب سے پہلے متکلّم ہیں اور تاریخ میں اسی حیثیت سے معروف ومشہور چلے آرہے ہیں اور ان کے اعمال مجیدہ میں یہی ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے انھیں بقائے دوام کا خلعت عطا کردیا ہے!

۱۔ الخطط، ج ۴، ص ۱۸۳

۲۔ الملل والنحل، ج ۱، ص ۶۱، ۶۲۔ شرح العیون، ص ۱۲۰

مستشرق نیبرج کا بیان

مستشرق نیبرج کا بیان ہے کہ معتزلہ متکلمین نے پورے انہماک اور سرگرمی کے ساتھ وہ کام ہاتھ میں لیا جس کی ان کے زمانے میں اسلام کو سخت و شدید ضرورت تھی۔ اس زمانے کا چلن اور رواج ہی یہ تھا کہ وہ مذاہب جو چھائے ہوئے تھے اپنے دین کے فضائل و محاسن اور شوکت و قوت کا مظاہرہ اس اسلوب متین اور طریق فلسفی سے کیا کرتے تھے لہٰذا معتزلہ کے لیے ضروری اور بہت ضروری تھا کہ ان ابحاث و دقائق میں پورا پورا حصہ لیں تاکہ اسلام تحدّی کے ساتھ ادیانِ غیر کا مقابلہ کر سکے۔[1]

پس بجا طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ معتزلہ نے اپنے اس عمل سے نہ صرف دین اسلام کا دفاع کیا بلکہ اسے دوسری امتوں اور قوموں سے ذہنی اور فکری طور پر بہت زیادہ قریب کر دیا۔ انھیں اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ اور یوں اسلام کے نہوض و انتشار میں انھوں نے غیر معمولی حصہ لیا۔

فلسفہ بجائے خود مقصود نہ تھا لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

معتزلہ نے حصولِ فلسفہ کی طرف توجہ اس لیے مبذول نہیں کی تھی کہ انھیں فلسفے سے بجائے خود کوئی دلچسپی تھی۔ انھوں نے دین اسلام کے اعداء و خصوم کا رد کرنے کے لیے بطور خادم کے فلسفے سے کام لیا تھا۔

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں سے تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ یہ دور محض معتزلہ سے تھا۔ فلسفے نے ان کی زندگی کو ایک عظیم و خطیر انقلاب سے دوچار کر دیا۔ اور ان کی تفکیر میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ جب انھوں نے باقاعدہ فلسفے کا مطالعہ کیا اور اس پر عبور حاصل کیا تو رفتہ رفتہ وہ فلسفے سے بہ حیثیت فلسفہ دلچسپی لینے لگے اور اس سے ان کی وابستگی بڑھتی گئی۔ اس صورت احوال کے نتائج دو صورتوں میں برآمد ہوئے۔

۱۔ مقدمۃ الانتصار، ص ۵۸

۱۔ معتزلہ فلاسفۂ یونان کی عظمت کے ثنا خواں ہونے لگے۔ جس نظر سے ہم انھیں دیکھتے ہیں اس کے مقابلے میں وہ جس نگاہ سے فلاسفۂ یونان کو دیکھتے تھے اس میں بزرگی اور عظمت اور تقدس کی کارفرمائی اب شامل ہو گئی تھی۔ ہوتے ہوتے وہ ان فلاسفہ کے اقوال پر گویا ایمان لے آئے اور ان پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرنے لگے جیسا کہ اولیری کا بھی قول ہے[1] کہ وہ فلاسفہ سے یکسر ہم آہنگ ہوتے چلے گئے۔ اب معتزلہ نے ایک دوسرا کام شروع کر دیا یعنی دین اسلام اور فلسفۂ یونان کے مابین توفیق و تطبیق۔ مثال میں ہم ابن رشد، فارابی اور الکندی وغیرہ کا نام لے سکتے ہیں۔

۲۔ رفتہ رفتہ بہت آہستہ اور غیر محسوس طور پر معتزلہ اپنے اہداف دینی سے دور تر ہوتے چلے گئے اور تدریجاً عقائد لاہوتیہ سے دست کش ہوتے گئے۔ اور مسائل فلسفیہ کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوتے گئے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آگیا جب یہ صرف فلسفی ہو کر رہ گئے۔ اور ان کی بحث و گفتگو کا مرکز خالص فلسفی مباحث مثلاً حرکت و سکون، جوہر و عرض، موجود و معدوم اور جزء ولا یتجزیٰ[2] رہ گیا۔

مذہب اور فلسفے میں ہم آہنگی یہ تھا معتزلہ کا اشتغال، لیکن ان کا شغف فلسفیانہ مباحث میں بھی زیادہ سے زیادہ بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفے سے ان کا تاثر اتنا بڑھ گیا کہ ان کے اکثر اقوال اس رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ مستشرق شٹینر کا قول ہے کہ اعتزال اپنے تطورات اخیرہ میں یکسر فلسفۂ یونانیہ سے

۱۔ De Lacy O. Leary
Arabic Thought & its place in history, p. 123

۲۔ جزء لا یتجزیٰ ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو قطع کرتے چلے جایئے آخر میں کٹتے کٹتے ایک جز باقی رہ جائے گا جسے قطع کرنا ممکن نہ ہوگا۔ یہی جزء لا یتجزیٰ ہے لیکن ایٹم کے دور میں یہ سوال بھی ختم ہو گیا۔ (رئیس احمد جعفری)

متاثر ہو کر رہ گیا تھا۔

اولیری کا خیال ہے کہ اسلامی تعلیمات میں یونانی فلسفہ کے اثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے معتزلہ کو اوّل فلاسفۂ اسلام بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور متاخرین فلاسفۂ اسلام پر ان کی فضیلت ظاہر ہے اس لیے کہ وہ معتزلہ ہی ہیں جنھوں نے بابِ فلسفہ پر دستک دی، اور علوم فلسفہ کے ترجمے پر توجہ کی اور متاخرین کو اس سے روشناس کرایا اور ان کے لیے ایک راستہ تیار کر دیا۔